شرعی اصطلاحات اور ان سے متعلق چند مباحث

مولانا عبید الرحمٰن مایار، مردان

اصطلاحات کا پسِ منظر

جس طرح ہر فکر و فلسفہ اپنے تئیں کچھ مخصوص اصطلاحات رکھتا ہے جن کا اپنا مخصوص پسِ منظر ہوتا ہے اور ان اصطلاحی الفاظ کو اپنے مقرر کردہ مفہوم و معنی میں لینا ضروری ہوتا ہے، ان الفاظ کا لغوی معنی مقصود ہوتا ہے اور نہ ہی متعلقہ فن کی باتوں کو ان الفاظ کے لغوی معنیٰ پر حمل کرنا درست ہوتا ہے۔ یوں ہی دینِ اسلام اور شریعتِ اسلامیہ بھی اپنے دامن میں کچھ اصطلاحی الفاظ رکھتے ہیں اور قرآن وسنت میں اگر وہ الفاظ استعمال ہو جائیں تو ان سے وہی مقرر کردہ مراد و مفہوم لینا ضروری ہوتا ہے جو شریعت نے طے کیا ہوتا ہے۔ ان سے عام لغوی معنی مراد لینا اور نصوص کو اسی لغوی معنی پر حمل کرنا کسی طرح درست نہیں ہوتا۔

شرعی اصطلاحات کی اہمیت

ان اصطلاحات کو جاننے کی ضرورت اس لیے بھی بڑھ جاتی ہے کہ بہت سے شرعی احکام و مقاصد کا تحفظ اس پر موقوف ہے، چنانچہ قرآن وسنت کی بیسیوں نصوص ایسی ہیں جن میں مختلف الفاظ کے ساتھ کچھ احکام، فضائل یا وعیدات ذکر ہوتے ہیں، ان احکام وغیرہ کا مصداق ان الفاظ کا لغوی مفہوم نہیں ہوتا، بلکہ شریعت نے اس کا جو مفہوم مقرر فرمایا ہوتا ہے وہی مقصود ہوتا ہے اور اسی کے ساتھ متعلقہ حکم، فضیلت یا وعید کو مربوط کرنا مطلوب ہوتا ہے۔ ان جیسے نصوص کو اگر شرعی مفاہیم پر حمل نہ کیا جائے تو دین میں تحریف کا دروازہ کھل جاتا ہے، لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ بحالتِ موجودہ اسی بے اصولی کے آئے دن مظاہر سامنے آتے رہتے ہیں اور علمی رسوخ، اصولی مہارت اور مزاج میں اعتدال نہ ہونا وغیرہ کچھ عناصر کی وجہ سے اس نوع کی غلطیاں بکثرت پیش آتی رہتی ہیں۔

شرعی اصطلاح کیونکر بنتی ہے؟

اس سلسلہ میں بنیادی بات یہی ہے کہ کوئی چیز شرعی اصطلاح کیونکر بنتی ہے؟ کسی لفظ کو شرعی اصطلاح کی حیثیت کب حاصل ہوتی ہے؟ اصولی طور پر دیکھا جائے تو درج ذیل صورتوں میں کوئی چیز شرعی اصطلاح کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے:

۱: شریعت کوئی لفظ نئے سرے سے وضع کرے اور ایک خاص طے شدہ مفہوم میں اس کو استعمال کرے۔ ''نئے سرے'' کا مطلب یہ ہے کہ پہلے سے وہ لفظ مستعمل نہ ہو، ایسے لفظ کا شرعی اصطلاح ہونا محتاجِ بیان نہیں ہے، تاہم اس کی مثال نایاب یا کمیاب ہے۔

۲: لفظ تو پہلے سے عربی زبان اور عربی محاورات میں استعمال ہوتا رہا ہے، لیکن شریعت نے اس کو ایک خاص جامہ پہنایا اور لغوی معنی سے ہٹ کر کسی دوسرے معنی میں استعمال کیا۔ مثال کے طور پر ''زکوۃ'' کا لفظ ہے کہ عربی دان کے لیے شریعت کے آنے سے پہلے بھی یہ لفظ کوئی اجنبی نہیں تھا، بلکہ وہ اس لفظ اور اس کے معنیٰ سے واقف تھے اور روزمرہ کے محاورات میں استعمال بھی کرتے تھے، لیکن شریعت نے اس کو لغوی معنی (بڑھوتری) سے ہٹا کر ایک دوسرے معنی میں استعمال کیا جو ایک خاص قسم کی عبادت ہے اور یہ نیا مفہوم ایسا ہے کہ عرب کے باشندے پہلے اس سے بالکل مانوس نہ تھے۔

۳: لفظ پہلے سے عربی زبان میں استعمال ہوتا ہو اور شریعت نے اس لغوی معنی کو کلی طور پر متروک نہ کیا ہو، تاہم اس میں کوئی تغیر کیا ہو، چاہے وہ تغیر کمی کی صورت میں ہو یا زیادتی کی شکل میں، لیکن ضروری ہے کہ یہ تغیر اس لفظ کے شرعی مفہوم میں داخل کر دیا جائے، جس کی نشانی یہی ہے کہ اگر وہ تغیر موجود نہ ہو تو شریعت کی نظر میں وہ چیز ہی معتبر نہ ہو اور اس پر متعلقہ احکام مرتب نہ ہوں۔

امام کرخی رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے ان کے شاگرد امام جصاص رازی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں کہ: وہ آیتِ کریمہ ''السَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ'' کے عموم سے استدلال کرنے کو درست نہیں سمجھتے تھے اور اس کی وجہ یہی بیان فرماتے تھے کہ اس کا لغوی معنی و مفہوم شریعت نے برقرار نہیں رکھا، بلکہ اس میں مختلف تغیر و تصرف فرمایا ہے، اب اس سے اپنا لغوی معنی مراد لینا درست نہیں ہے۔ ''فصول في الأصول'' میں ہے:

''وَقَدْ كَانَ شَيْخُنَا اَبُوْ الْحَسَنِ الْكَرْخِيُّ رَحِمَهُ اللهُ يَقُوْلُ مَرَّةً فِيْ قَوْلِهٖ تَعَالٰى: ''السَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْا اَيْدِيَهُمَا'' إِنَّهٗ (مِنَ الْمُجْمَلِ) لَا يَصِحُّ الْاِحْتِجَاجُ بِعُمُوْمِهٖ لِتَعَلُّقِ الْحُكْمِ فِيْهِ بِمَعَانٍ لَا يَنْتَظِمُهَا الْاِسْمُ وَلَيْسَ هُوَ عِبَارَةً عَنْهَا مِنْ نَحْوِ الْمِقْدَارِ وَالْحِرْزِ، فَصَارَ كَاسْمِ الصَّلَاةِ وَالزَّكَاةِ وَالصَّوْمِ وَنَحْوِهَا لِتَعَلُّقِ

الْحُكْمِ فِيْهَا بِمَعَانٍ لَمْ يَكُنِ الْاِسْمُ مَوْضُوْعًا لَهَا فِي اللُّغَةِ.''

ترجمہ: ''ہمارے شیخ ابوالحسن کرخی رحمہ اللہ نے ایک بار آیتِ کریمہ ''السَّارِقُ وَ السَّارِقَةُ'' کے بارے میں ذکر فرمایا کہ یہ مجمل ہے، جس کے عموم سے استدلال کرنا درست نہیں ہے، کیونکہ یہ حکم ایسے امور کے ساتھ مربوط ہے جس کو لفظِ ''سرقہ'' (لغوی لحاظ سے) شامل نہ تھا، مثال کے طور پر خاص مقدار اور حفاظت کا ضروری ہونا، لہٰذا یہ لفظ ''صلاۃ''، ''زکاۃ'' اور ''صوم'' جیسے الفاظ کی طرح ہوگیا، ان تمام الفاظ میں شرعی حکم کا تعلق ایسے امور کے ساتھ ہے جن کے لیے یہ الفاظ لغوی لحاظ سے موضوع نہ تھے۔''

ان آخری دونوں صورتوں کو شرعی اصطلاح قرار دینے کی وجہ یہ ہے کہ یہاں لفظ گو اپنے اصل معنی میں پہلے ہی سے استعمال ہوتا ہے اور زبان داں شروع ہی سے اس سے واقف ہوتے ہیں، لیکن شریعت نے اس کا جو خاص مفہوم ومصداق مقرر کیا ہے، وہ پہلے معلوم نہ تھا یا متبادر نہ تھا، شریعت کی تعیین وتحدید کی وجہ سے چونکہ وہ اس لفظ کا مصداق ٹھہرا، اس لیے اس معنی میں اس کو شرعی اصطلاح کہا جاتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس کو ''منقولِ شرعی'' سے بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔

اصولی حیثیت کا جائزہ

''صلاۃ''، ''زکاۃ'' اور ''صوم'' جیسے الفاظ، جن کو ہم شرعی اصطلاحات کہتے اور سمجھتے ہیں، ان کی اصولی نوعیت کیا ہے؟ علامہ ابن الہمام رحمہ اللہ نے اس پر مختصر مگر پُرمغز گفتگو فرمائی ہے، ان کی مشہور اصولی کتاب ''تحریر'' اور اس کی شرح ''تقریر'' میں ہے:

'' (مسألة لا خلاف أن) الأسماء (المستعملة لأهل الشرع من نحو الصلاة والزكاة) في غير معانيها اللغوية (حقائق شرعية يتبادر منها ما علم) لها من معانيها المذكورة (بلا قرينة) سواء كان ذٰلك لمناسبة بينهٗ وبين المعنى اللغوي، فيكون منقولا أو لا، فيكون مبتدأ (بل) الخلاف (في أنها) أي الأسماء المستعملة لأهل الشرع في المعاني المذكورة حقيقة (عرفية للفقهاء) أي بسبب وضعهم إياها لتلك المعاني، فهي في تخاطبهم تدل عليها بلا قرينة. وأما الشارع فإنما استعملها فيها مجازا عن معانيها اللغوية بمعونة القرائن، فلا تحمل عليها إلا بقرينة (أو) حقيقة شرعية (بوضع الشارع) حتى أنها في كلامهٖ وكلامهم تدل عليها بلا قرينة، (فالجمهور) الواقع (الثاني) أي أنها حقيقة شرعية (فعليه) أي الثاني (يحمل كلامهٗ) أي الشارع. وكلام أهل الفقه والأصول ومن يخاطب باصطلاحهم أيضا إذا وقعت

مجردة عن القرائن لأنه الظاهر منه ومنهم (والقاضي أبو بكر) الواقع (الأول) أي أنها حقيقة عرفية للمتشرعة لا للشارع (فعلى اللغوي) يحمل إذا وقعت في كلامهٖ محتملة للغوي والشرعي (إلا بقرينة) توجب حملهٗ على الشرعي لزعمهٖ أنها مبقاة على حقائقها اللغوية على ما زعمهٗ بعضهم وسيأتي ما يوافقهٗ في الاستدلال كما ينبه المصنف عليه .''

ترجمہ: ''اس بات میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ اہلِ شرع جو الفاظ اپنے معنی لغوی کے علاوہ دوسرے معانی میں استعمال کرتے ہیں، ان کو حقیقتِ شرعیہ کہا جاتا ہے، جیسے لفظ صلاۃ اور زکاۃ، اور ذہن ان معانی کی طرف بغیر کسی قرینہ کے چلا جاتا ہے، چاہے یہ معنی لغوی اور منقولی میں کسی مناسبت کے طور پر ہو یا بغیر کسی مناسبت کے ہو، پہلے کو منقولی کہا جاتا ہے اور دوسرے کو مبتدأ، بلکہ اختلاف اس بات میں ہے کہ فقہاء کے ہاں یہ حقیقتِ عرفیہ ہے یا شرعیہ؟ یعنی فقہاء نے ان الفاظ کو ان کے اپنے معانی کے لیے وضع کیا ہے تو یہ ان کی اصطلاح میں بغیر کسی قرینہ کے ان معانی پر دلالت کرتے ہیں، اور شارع نے قرائن کی بنیاد پر اپنے لغوی معانی سے نقل کر کے دوسرے معانی میں مجازاً استعمال کیا ہے، تو اب قرینہ کے بغیر ان الفاظ کو منقول الیہ معانی پر محمول نہیں کیا جائے گا، یا حقیقتِ شرعیہ ہے، یعنی شارع نے ان الفاظ کو انہی معانی کے لیے وضع کیا ہے، تو شرع اور فقہاء کی اصطلاح میں بغیر قرینہ کے ان معانی پر دلالت کرے گا؟

جمہور کا مسلک یہ ہے کہ یہ حقیقتِ شرعیہ ہے، اور شارع، اہلِ فقہ اور اصولِ فقہ والوں کا کلام اسی پر محمول کیا جائے گا، اگر بغیر کسی قرینہ کے پایا جائے، اور قاضی ابوبکرؒ کے ہاں یہ حقیقتِ عرفیہ ہے، تو جب یہ لفظ ایسی جگہ پر پایا جائے کہ جہاں دونوں معانی کا احتمال رکھتا ہو تو اہلِ لغت اس کو معنی لغوی پر محمول کریں گے، الا یہ کہ وہاں کوئی ایسا قرینہ پایا جائے کہ وہ شرعی معنی پر حمل کرنے کا تقاضا کرتا ہو تو اس صورت میں اسی پر محمول کیا جائے گا، اس لیے کہ اہلِ لغت کا گمان یہ ہے کہ یہ اپنے حقیقی معنی لغوی میں برقرار ہے، لہٰذا بغیر قرینہ کے دوسرے معنی پر محمول نہیں کیا جائے گا۔ اور استدلال کرنے میں اسی کے موافق مزید تفصیل آگے آجائے گی، جیسا کہ مصنف اس پر تنبیہ کرے گا۔''

اس عبارت کا حاصل یہ ہے کہ درج بالا الفاظ اور شرعی اصطلاحات کی اصولی نوعیت کے بارے میں اہلِ علم کے دو موقف ہیں:

الف: یہ الفاظ ان مخصوص معانی میں حقیقتِ شرعیہ ہے جن کو خود شریعت نے ہی ان مفاہیم کے لیے متعین کر رکھا ہے۔

ب: یہ الفاظ ان مخصوص معانی میں حقیقتِ شرعیہ نہیں ہے جن کو خود شریعت نے ہی ان مفاہیم کے لیے متعین کر رکھا ہو، بلکہ اپنے اصل کے لحاظ سے تو یہ الفاظ لغوی معانی میں ہی استعمال ہوتے تھے، شریعت نے کسی قرینے پر اعتماد کرتے ہوئے اس کو مجاز کے طور پر اپنے ان متعین کردہ مفاہیم میں استعمال کیا ہے۔

دونوں اقوال میں اختلاف کی بنیاد پر فرق یہ سامنے آئے گا کہ اگر الفاظ کو ان معانی میں شرعی حقیقت تسلیم کر لیا جائے تو وہی اس کے اصل حقیقی معانی متصور ہوں گے اور ان شرعی مفاہیم کے مراد لینے کے لیے کسی خارجی قرینے کی ضرورت نہ رہے گی، بلکہ جس طرح ہم دیگر الفاظ بول کر اس کے حقیقی معنی ہی مراد لیتے ہیں اور اس کے لیے کسی دلیل وسہارے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے، یوں ہی اگر نصوص میں اس قسم کے الفاظ استعمال ہو جائیں، تو ان سے اپنا شرعی مفہوم ہی مراد ہوگا اور اس کے لیے کسی قرینے کی ضرورت محسوس نہیں ہوگی۔ اگر شرعی حقیقت کی بجائے اس کو حضرات فقہائے کرام کی عرفی حقیقت قرار دیا جائے تو اس صورت میں نتیجہ یہ ظاہر ہوگا کہ جن نصوص میں یہ الفاظ استعمال ہوں، وہاں ان سے شرعی یا فقہی مفہوم مراد نہیں ہوگا، بلکہ متبادر لغوی مفہوم ہی اس سے مراد ہوگا، البتہ اگر اس کے خلاف پر کوئی قرینہ قائم ہو تو اس کے مطابق مفہوم متعین ہوگا۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ شرعی حقیقت ماننے کی صورت میں ان الفاظ سے شرعی مفاہیم ہی مراد ہوں گے اور لغوی معنی مراد لینے کے لیے قرینہ کی ضرورت ہوگی، جبکہ دوسرے قول کے مطابق معاملہ برعکس ہوگا، یعنی نصوص میں جہاں یہ الفاظ ذکر ہوں گے، وہاں ان سے عام لغوی معانی ہی مراد ہوں گے، اس کے علاوہ مفہوم مراد لینے کے لیے قرینہ کی ضرورت ہوگی۔

اب ان میں سے پہلا قول تو جمہور اصولیین اور حضرات فقہائے کرام کا ہے، جبکہ دوسرا قول امام باقلانی رحمۃ اللہ علیہ کی جانب منسوب ہے اور علامہ قاضی بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ سے بھی یہی منقول ہے۔ دلیل وتوجیہ کے لحاظ سے جمہور ہی کا قول زیادہ راجح ہے، چنانچہ علامہ ابن الہمام رحمۃ اللہ علیہ نے درج بالا عبارت کے بعد امام باقلانی رحمۃ اللہ علیہ کی دلیل کا جواب بھی دیا ہے۔

شرعی اور فقہی اصطلاح کا فرق

شرعی اصطلاح کی تعیین وتحدید شریعت کے مصادر سے ہی ہوسکتی ہے، جبکہ علمِ فقہ یا دیگر علوم

وفنون کی اصطلاحات کی تحدید کے لیے نص کا ہونا ضروری نہیں ہے، بلکہ کسی بھی علم وفن والے کسی بھی وقت اس کا تعین کر سکتے ہیں۔ استعمال کے لحاظ سے دونوں میں فرق یہ ہے کہ:

الف: شرعی نصوص یعنی قرآن وحدیث میں اگر کوئی لفظ مستعمل ہے تو اگر وہ لفظ ایسا ہو جس کا شریعت نے عام لغوی معنی سے ہٹ کر کوئی مفہوم ومصداق متعین کیا ہو، جس کی تفصیل اوپر ذکر کی جا چکی ہے، تو اس سے وہی شرعی مفہوم ہی مراد ہوگا۔

ب: شرعی نصوص میں استعمال ہونے والا لفظ اگر ایسا نہ ہو جو اصولی معنی میں شرعی اصطلاح کہلاتا ہے تو اس سے متبادر لغوی معنی ہی مراد ہوگا۔ ایسے الفاظ کو لغوی متبادر معانی سے ہٹا کر کسی دوسرے معنی ومفہوم پر حمل کرنا جائز نہیں ہے، بلکہ تحریفِ دین کا راستہ ہے، البتہ اگر اس متبادر معنی مراد لینے سے کوئی اصولی مانع موجود ہو تو دوسری بات ہے۔

ج: جس طرح شرعی نصوص کو متبادر لغوی معانی سے پھیر کر کسی دوسرے مفہوم پر حمل کرنا بھی کسی طرح درست نہیں ہے، یوں ہی ان نصوص کو ان فنی اور فقہی اصطلاحات پر حمل کرنا جائز نہیں ہے جو بعد کے دور میں اہلِ علم نے متعین فرمائی ہوں۔

اصطلاح مقرر کرنے کا حکم

اگر کسی علم وفن والے اپنے لیے کوئی اصطلاح وضع کرنا چاہیں تو اس میں بذاتِ خود کوئی مضائقہ نہیں ہے، چاہے اس کے لیے کوئی نیا لفظ ایجاد کریں یا کسی لفظ کو عام لغوی معنی سے پھیر کر اصطلاحی مفہوم کے لیے متعین کریں، دونوں صورتوں میں ممانعت کی کوئی بات نہیں ہے۔ یوں ہی اگر کوئی گروہ/ جماعت اپنے لیے اس طرح کوئی اصطلاح مقرر کرنا چاہے تو چونکہ اصل اشیاء میں اباحت ہے، اس لیے اس میں بھی مضائقہ نہیں ہے، چنانچہ مشہور ہے کہ: ''لا مشاحة في الاصطلاح'' اصطلاح مقرر کرنے میں نزاع کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

تاہم یہ ساری تفصیل فی نفسہٖ اصطلاح مقرر کرنے میں ہے۔ اگر اس کے ساتھ کچھ خارجی عناصر مل جائیں اور وہ عوامل ایسے ہوں جو اس کے ناجائز ہونے کے متقاضی ہوں تو اس کو ان عوامل کی بنیاد پر ناجائز ہی کہا جائے گا، مثال کے طور پر قادیانی لوگ جن کے کافر ہونے پر پوری امت کا اجماع واتفاق ہو چکا ہے، وہ اپنے بڑوں کو خلفاء، اپنی عبادت گاہوں کو مساجد، مقبرے کو جنت البقیع نام دیتے ہیں تو چونکہ اس اصطلاح کی اجازت دینے میں متعدد شرعی مفاسد ہیں، اس لیے یہ ممنوع ہی کہلاتے ہیں اور کسی صورت

میں ان جیسی اصطلاحات وضع کرنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔

یہی وہ اصولی نکتہ ہے جس پر کما حقہ غور نہ کرنے کی وجہ سے شرعی احکام ومسائل بیان کرنے میں دسیوں غلطیاں اور غلط فہمیاں جنم لیتی ہیں، اس کا حاصل یہ ہے کہ ایک کسی چیز کی ذاتی حیثیت سے اس کا حکم ہوتا ہے اور دوسرا خارجی عوامل اور بیرونی عناصر کی بنیاد پر اس کی حیثیت ہوتی ہے، ضروری نہیں ہے کہ دونوں حیثیتوں سے کسی چیز کا حکم ایک جیسا ہو، بلکہ سیکڑوں ایسی صورتیں ہوسکتی ہیں جہاں فی نفسہٖ کسی چیز کا حکم الگ ہوتا ہے اور خارجی عوامل کی بنیاد پر اس کا حکم مختلف ہوجاتا ہے۔

شرعی اصطلاح کا حکم

جس طرح دیگر تمام علوم وفنون کا یہ ضابطہ ہے کہ اصطلاحی الفاظ سے اصطلاحی معانی ہی مراد ہوں گے، ایسے الفاظ کو محض عام لغوی معنی پر حمل کرنا درست نہیں ہے، بلکہ متعلقہ علم وفن کی سراسر خلاف ورزی ہے، یوں ہی شرعی اصطلاحات کا بھی یہی حال ہے، لہٰذا قرآن وحدیث میں اگر ایسے الفاظ ذکر ہوں تو ان سے اصطلاحی مفہوم مراد لینا ہی ضروری ہے، ان کو محض عام متبادر لغوی معنی پر حمل کرنا کسی طرح جائز نہیں ہے۔ عام علوم وفنون کی بنسبت شرعیات میں اس کا زیادہ اہتمام اس لیے بھی ضروری ہے کہ ان کے ساتھ دینی احکام، فضائل یا وعیدات وغیرہ متعلق ہوتے ہیں، غلط مفہوم مراد لینے کی صورت میں دینی احکام وفضائل میں غلطی لازم آئے گی جس کا مذموم ہونا محتاجِ بیان نہیں ہے۔

غور کیا جائے تو واضح ہوجاتا ہے کہ یہ دین میں معنوی تحریف کے مترادف ہے کہ شریعت نے اصطلاحی مفہوم کے متعلق کوئی حکم بتایا ہے اور سننے والا اس کو لغوی مفہوم پر چسپاں کررہا ہے، یا دینی لحاظ سے وہ فضیلت شرعی اصطلاحی مفہوم کی ہوتی ہے اور سننے والا اس کو خواہ مخواہ لغوی معنی پر حمل کرتا ہے جس کے بہت سے افراد ایسے ہیں جو شرعی اصطلاح کے تحت داخل نہیں ہوتے۔ اب ایسا اقدام کرنے والا نص کا انکار تو نہیں کرتا، لیکن اس کا جو معنی ومفہوم یا عملی میدان کار ودائرہ کار شریعت نے طے کررکھا ہے، اس کو تسلیم نہیں کرتا، بلکہ اس میں اپنی طرف سے بے ضابطہ تصرف کرتا ہے، گویا نص کا مدلول اپنی طرف سے تلاش کرتا ہے، تحریف معنوی کی صورت بھی یہی ہوتی ہے۔ (الفصول في الأصول، باب في معنى المجمل، فصل المجمل على وجهين، ج:١، ص:٦٨)

علامہ جصاص رازی رحمہ اللہ نے اس کو اگرچہ مجمل کہا ہے، چنانچہ امام کرخیؒ کا قول نقل کرنے کے بعد اپنا یہی موقف ذکر کیا ہے کہ میرے نزدیک یہ مجمل ہے اور اس عبارت سے پہلے اسی علت کی بنیاد

پر لفظ ''صلاۃ'' کو مجمل قرار دیا ہے کہ وہ لغت کے لحاظ سے جس معنی میں استعمال ہوتا تھا، شریعت نے اس لفظ کو اس معنی میں استعمال نہیں کیا، فرماتے ہیں:

''وَالصَّلَاةُ الدُّعَاءُ فِي اللُّغَةِ، وَقَالَ اللهُ تَعَالٰى: ''يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا'' وَقَدْ أُرِيْدَ بِهٰذِهِ الْأَسْمَاءِ مَعَانٍ لَمْ يَكُنِ الِاسْمُ مَوْضُوْعًا (لَهَا) فِي اللُّغَةِ، فَمَتٰى وَرَدَ شَيْءٌ مِنْ هٰذِهِ الْأَلْفَاظِ مُطْلَقًا وَلَمْ يَكُنِ الْمُرَادُ بِهَا إِشَارَةً إِلَى مَعْهُوْدٍ فَهُوَ مُجْمَلٌ مُحْتَاجٌ إِلَى الْبَيَانِ.''

لیکن یہ تفصیل اس بات کے خلاف نہیں ہے کہ اس کو شرعی اصطلاح قرار دیا جائے، بلکہ انجام کار دونوں کا حاصل ایک ہی نکلتا ہے، چنانچہ اس کو شرعی اصطلاح قرار دیا جائے اور یا مجمل، دونوں صورتوں میں لغوی معنی پر حمل کرنا درست نہیں ہے اور شرعی نصوص کی روشنی میں ہی اس کی مراد ومقصود متعین کیا جا سکتا ہے۔ (التقریر والتحبیر، المقام الأول في بیان معنی اللغة، أقسام المفرد والمرکب، الفصل الخامس في المفرد باعتبار استعمالہ، مسألة الأسماء المستعملة لأهل الشرع من نحو الصلاة والزکاة، ج:۲، ص:۱۰)

امام باقلانی رحمۃ اللہ علیہ کے اس موقف کی دلیل کیا ہے؟ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے اس پر گفتگو کرتے ہوئے ان کے دو دلائل ذکر فرمائے ہیں:

''الف: قرآن عربی زبان میں ہے اور اسی زبان میں اس کا نزول ہوا ہے، لہٰذا نصوص کا جو معنی عربی لغت میں معروف ومتبادر نہ ہو، وہ مراد لینا درست نہیں ہے۔

ب: اگر شریعت نے کسی لفظ یا چند الفاظ کو واقعۃً لغوی معنی سے پھیر کر کسی دوسرے معنی میں استعمال کیا ہے جس کو شرعی اصطلاح کا عنوان دیا جاتا ہے تو اس صورت میں تمام مکلف انسانوں کو اس کی خبر دینا ضروری تھا، تاکہ وہ نص کے سمجھنے اور پھر اس پر عمل پیرا ہونے میں کسی غلط فہمی کے شکار نہ ہوں، حالانکہ ہم دیکھتے ہیں کہ ایسے نصوص موجود نہیں ہیں، لہٰذا یہ دعویٰ ہی بے بنیاد ہے۔''

امام باقلانی رحمۃ اللہ علیہ کے ان استدلالات پر امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مفید اصولی کتاب ''المستصفٰی'' میں سیر حاصل گفتگو فرمائی ہے، تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں: المستصفی، القطب الثالث في کیفیة استثمار الأحکام من مثمرات الأصول، المقدمة وتشتمل علٰی سبعة فصول، الفصل الرابع في الأسماء الشرعیة، ص:۱۸۲